میرزا ادیب

علامہ اقبال اور مغربی تہذیب

علامہ اقبال نے اپنے اردو اور فارسی کلام میں تہذیبِ مغرب کے خلاف تسلسل اور تواتر کے ساتھ اظہار رائے کیا ہے اور یہ سلسلہ آخر تک قائم رہا ہے۔ تاہم اس فرق کے ساتھ کہ جہاں تک ان کی دورِ اول کی شاعری کا تعلق ہے، مغربی تہذیب پر علامہ کی تنقید ایک اعتبار سے معتدلانہ ہے مگر اپنے آخری دور کی شاعری میں یہ مخالفت بڑی شدید ہو گئی ہے۔ چنانچہ بانگ درا میں اس تہذیب کے متعلق ان کا رویہ مخالفانہ تو ہے مگر اس میں ایک حد تک ملائمت اور لچک بھی ہے۔ اس کے برعکس ضربِ کلیم اور بالخصوص فارسی مثنوی "پس چہ باید کرد" میں وہ مغربی تہذیب کو اپنی انتہائی سخت تنقید کا ہدف بنانے میں قطعاً تامل نہیں کرتے۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب اپنی معنوی وسعت کے لحاظ سے صرف ایک دائرے میں محدود نہیں رہتی بلکہ وہ تین اور دائروں میں بھی حرکت کرتی رہتی ہے اور یہ دائرے ہیں فرنگ یا فرنگی مدنیت۔ نئی تہذیب، دورِ حاضر اور سیاسیات حاضرہ۔

۱۹۰۵ سے لے کر ۱۹۰۸ء تک اقبال نے تین سال یورپ کی سرزمین پر گزارے تھے۔ یہ ان کا تعلیمی سفر تھا۔ ظاہر ہے ان کے بیشتر شب و روز تعلیمی مصروفیات میں صرف ہوتے تھے۔ پھر بھی وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ یورپ کے ممالک کی وطنی عصبیت نسلِ انسانی کے لیے ایک مہیب خطرہ بنتی جا رہی ہے اور خطرے کا یہ احساس ان دو شعروں میں ڈھل گیا ہے:

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

یہ پہلی جنگ عظیم سے سات آٹھ سال بیشتر کا دور ہے مگر اکا دکا واقعات بتا رہے تھے کہ چند

سال بعد کیا ہونے والا ہے۔ ابھی وہ آگ بھڑکی نہیں تھی جس کے شعلوں میں صدیوں کی انسانی کوششوں کا حاصل ایک قلیل مدت میں خاکستر ہونے والا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے قریبی زمانے میں یورپ کی فاتح اقوام نے کمزور ملکوں خصوصاً اسلامی ملکوں کو اس طرح پامال کر دیا کہ ان میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی توانائی بھی باقی نہ رہی۔ یورپ کے کرگسوں نے سب سے بُرا حال اس اسلامی ملک کا کیا جس کے ساتھ علامہ اقبال اور ان کے ہندوستانی افرادِ ملت کی انتہا درجے کی شیفتگی وابستہ تھی۔ اس ملک یعنی ترکی کے حصے بخرے کر دیے گئے۔ ایران کو اقتصادی طور پر تباہ کر دیا گیا۔ افریقہ کی مسلمان مملکتوں کو پابہ زنجیر کرنے کا اہتمام کر لیا گیا۔ ریاست ہائے بلقان نے ترکوں کی زبوں حالت کو زبوں تر کر دیا۔ یہ حال تو باہر کا تھا خود ہندوستان میں پنجاب کے فرعون صفت گورنر نے رولٹ ایکٹ کا سہارا لے کر نہتے انسانوں کے لہو سے جلیان والا باغ کی زمین کو لالہ زار کر دیا۔

یہ روداد تھی مغرب کے سیاسی تغلب کی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا اور سات سمندر پار کے تاجروں نے یہ بھی کیا کہ خام مال مشرقی ملکوں کے بازاروں سے سستے داموں خریدا اور اسے مصنوعات میں منتقل کر کے ان مصنوعات کو انہی بازاروں میں گراں قیمتوں پر فروخت کر دیا۔ علامہ نے 'پس چہ باید کرد' میں اس کا ذکر ان شعروں میں کیا ہے:

قالی[1] از ابریشم تو ساختند باز او را پیشِ تو انداختند
چشمِ تو از ظاہرش افسوں خورد رنگ و آب او ترا از جا برد

فرنگ کی اس تاجرانہ ذہنیت نے صرف اسی پہ اکتفا نہ کیا بلکہ دیسی مصنوعات کو بھی تباہ کر کے رکھ دیا اور ہمارے بازاروں کو یورپ کی مصنوعات کے لیے ایک وسیع منڈی بنا دیا۔

یہ فرنگ کی تاجرانہ ذہنیت کی اجارہ داری تھی مگر معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا تھا۔ فرنگ کی ریشہ دوانیوں نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کو حکمتِ عملی کے دائرے میں اس طرح پھیلا دیا تھا کہ ہر دیسی حکمران اپنے تخت پر ترساں و لرزاں رہتا تھا۔ علامہ کہتے ہیں:

منبریاں بایک دگر آویختند فتنہ ہائے کہنہ باز انگیختند
تا فرنگی قومے از مغرب زمین ثالث آمد در نزاعِ کفر و دیں
کس نہ داند جلوۂ آب از سراب انقلاب، اے انقلاب، اے انقلاب (پس چہ باید کرد، ص ۳۴)

---

[1] قالین

علامہ اقبال فرنگ کی فتنہ آفرینی اور فتنہ پروری سے بخوبی آگاہ تھے اور وہ افرادِ ملت کو مسلسل بتا رہے تھے کہ فرنگ کے پردے میں وہی ساحرِ الموط چھپا ہوا ہے جو اپنے حقیقت ناشناس عقیدت مندوں کو برگِ حشیش دے کر کہتا تھا کہ یہ شاخِ نبات ہے۔ علامہ کو فرنگی تہذیب کے ہر ہر پہلو، ہر ہر رُخ اور ہر ہر قول و عمل کے ہر ہر گوشے میں فریب کاری نظر آتی تھی۔ مغرب کی جمہوریت، مجلسِ اقوام، اصلاح و رعایات و حقوق یہ سب کچھ محض فریبِ فکر و نظر تھے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

(بانگِ درا، خضرِ راہ)

اور مجلسِ اقوام:

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند — بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

(پیامِ مشرق، جمعیت الاقوام)

میں نے شروع ہی میں ذکر کیا ہے کہ علامہ نے فرنگی تہذیب کی مخالفت اپنی زندگی کے آخری دور میں زیادہ شدت کے ساتھ کی ہے۔ چنانچہ اس مثنوی (پس چہ باید کرد) میں جو علامہ نے اپنی وفات سے صرف دو سال قبل مکمل کی تھی۔ مخالفت کی یہ لے تیز تر ہو گئی ہے:

اے ز افسونِ فرنگی بے خبر — فتنہ ہا در آستینِ او نگر
از فریبِ او اگر خواہی اماں — اشترانش را ز حوضِ خود براں
حکمتش ہر قوم را بے چارہ کرد — وحدتِ اعرابیاں صد پارہ کرد
تا عرب در حلقۂ دامش فتاد — آسماں یک دم اماں او را نہ داد

(مثنوی پس چہ باید کرد)

حکمتِ فرنگی کی سب سے بڑی شعبدہ کاری یہ تھی کہ اس نے ملتِ عربیہ کو ملتِ ترکیہ سے اس طرح بدظن کر دیا تھا کہ یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی پہ اُتر آئی تھیں۔ ایک طرف تو اس نے ان کو باہمی طور پر متصادم کر دیا اور دوسری طرف مسلسل ریشہ دوانیوں سے وحدتِ اعرابیاں کو بھی پارہ پارہ کر دیا۔ فرنگ بظاہر عربوں کی پشت پناہی کرتا رہا مگر درونِ خانہ انھیں سیاسی استبداد کا نشانہ بھی بناتا رہا۔ نتیجۃً جمعیتِ اعرابیاں منتشر ہو گئی اور کم و بیش ترکوں کا بھی یہی حشر ہوا:

حکمتِ فرنگی نے ہر کمزور کو تختۂ ہستی سے ختم کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ علامہ نے فرمایا ہے:

زندگانی ہر زماں در کشمکش   عبرت آموز است احوالِ حبش
شرعِ یورپ بے نزاعِ قیل وقال   برّہ را کرد است برگرگاں حلال

علامہ نے مغربی تہذیب کے بارے میں جو مخالفانہ رویہ اختیار کیا اس کے متعدد محرکات اور عوامل تھے۔ کچھ سیاسی نوعیت کے تھے، کچھ سماجی نوعیت کے اور کچھ نظریاتی نوعیت کے۔ انھیں اس تہذیب کے لادینی پہلو سے گہری شکائتیں ہیں۔

آہ از افرنگ و از آئین او   آہ از اندیشۂ لا دین او
علمِ حق را ساحری آموختند   ساحری نے، کافری آموختند
ہر طرف صد فتنہ می آرد نفیر   تیغ را از پنجۂ رہزن بگیر
اے کہ جاں را باز می دانی ز تن   سحرِ ایں تہذیبِ لادینی شکن

علامہ اقبال روس کے بڑے مداح ہیں۔ لیکن یہاں بھی اس انقلاب کے لادینی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتے۔

ہم چناں بینی کہ در دورِ فرنگ   بندگی با خواجگی آمد بہ جنگ
روس را قلب و جگر گردیدہ خوں   از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں
آں نظامِ کہنہ را برہم زد است   تیز نیشے بر رگِ عالم زد است
کردہ ام اندر مقاماتش نگہ   لاسلاطیں، لاکلیسا، لاالٰہ
فکرِ او در تند بادِ لا بماند   مرکبِ خود را سوئے الا نراند (پس چہ باید کرد)

تو علامہ کے زاویۂ نگاہ سے تہذیبِ مغرب "لا" کے مقام پر آکر رک گئی ہے، الاّ کی طرف رخ نہیں کرتی۔ لا ایک منفی قوت ہے اور جب تک یہ قوت الا کے حدود میں داخل نہیں ہو جاتی یہ غیر مکمل رہتی ہے اور اس کی ساری سرگرمیاں صرف ایک پہلو کو محیط ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ

لا و الا سازو برگِ امتاں   نفی بے اثبات مرگِ اُمتاں

علامہ ایک اور نقطۂ نظر سے بھی اس تہذیب کو نسلِ انسانی کے لیے ضرر رساں سمجھتے ہیں۔ مغرب کی ساری تگ و دو کا حاصل یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہے وہ عقل کی بدولت ہے اور وہ چیز جسے علامہ عشق کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس کی یہاں مطلقاً گنجائش نہیں ہے۔ اصل میں انھوں نے

مغرب کے کلچر اور تمدن کی اس بنا پر بھی شدید مخالفت کی ہے کہ اس کے بنیادی عناصر میں عقل اور مادہ پرستی شامل ہے۔ عقل لاکھ ترقی کر جائے اور اپنے انکشافات اور اکتشافات سے زندگی کو کہیں سے کہیں پہنچا دے۔ یہ ساری جدوجہد انسان کی مادی ترقیوں سے آگے نہیں بڑھتی۔ انسانی روح کے سارے تقاضے ان مادی ترقیوں کے ہجوم میں ان پھولوں کی طرح کملا کر رہ جاتے ہیں، جنھیں پانی اور روشنی سے محروم کر دیا گیا ہو۔ عقل اور عشق علامہ کے ہاں ایک بہت اہم مسئلے کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ علامہ عقل کے قائل ضرور ہیں مگر وہ اُسے عشق کے تابع رکھنا چاہتے ہیں۔ عقل ذوق نگاہ سے بے گانہ نہیں ہے تاہم اس کی سب سے بڑی خرابی یا خاص یہ ہے کہ اس میں جرأت رندانہ نہیں جیسا کہ علامہ نے اپنے ایک شعر میں کہا ہے:

عقل ہم عشق است و از ذوق نگہ بیگانہ نیست لیکن آں بے چارہ را ایں جرأت رندانہ نیست

عقل عشق کے بغیر خود غرض ہوتی ہے۔ اس کے سامنے صرف اپنی مصلحتیں رہتی ہیں۔ اور حصول اغراض میں اس کا رویہ اگر سنگ دلانہ ہو تو اسے کسی قسم کی فکر نہیں ہوتی۔ پیام مشرق میں علامہ نے ایک طنز آمیز نظم لکھی ہے جس کا عنوان ہے حکمتِ فرنگ:

کہتے ہیں کہ پارس میں ایک ادا فہم، رمز شناس اور نکتہ بیں شخص رہتا تھا۔ جاں کنی کے عالم میں اس نے بڑی سختی برداشت کی اور اس سختی کی وجہ سے وہ سراپا شکوہ بن کر یزدانِ پاک کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ دنیا بدل گئی ہے مگر فرشتۂ اجل کا اندازہ ابھی تک وہی پرانا ہے۔ زمانہ کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے اور یہ جان کنی کے لمحوں میں ابھی تک پرانے طور طریقوں ہی سے کام لیتا ہے:

فرنگ آفریند ہنرہا شگرف برانگیزد از قطرہ بحر ژرف
کشد گردِ اندیشہ پرکارِ مرگ ہمہ حکمتِ او پرستارِ مرگ
رود چوں نہنگ آبدوزش بہ یم ز طیارۂ او ہوا خوردہ سم
نہ بینی کہ چشم جہاں بین ہور ہمی گردد از غاز او روزِ کور
تفنگش بکشتن چناں تیز دست کہ از فرشتۂ مرگ را دم گسست
فرست ایں کہن ابلہ را در فرنگ کہ گیرد فنِ کشتنِ بے درنگ

اس کے بعد وہ شخص کہتا ہے:

یہ فن کشتن بے دو رنگ، فرنگ کی حکمت عملی ہے کیونکہ وہ زندگی کے ہر عمل کو عقل کی نظر سے دیکھتا ہے۔ انسان کے اپنے روحانی تقاضے کیا ہیں۔ روح کس طرح آسودگی حاصل کر سکتی ہے۔ طمانیت قلب کس شے کا نام ہے اور ضمیر کو انسانی اعمال پر کس طرح اثر انداز ہونا چاہیے۔ ان باتوں کی فرنگ کو کوئی پروا نہیں۔ خدا ترسی، رحم دلی، باہمی محبت، غم گساری، حسن سلوک، زندگی کے لطیف جذبات سے بروئے کار آتے ہیں اور عقل لطیف جذبات سے بے نیاز ہے۔ چنانچہ عقل کے پرستار یورپ کے رویے کی ترجمانی اقبال نے ضرب کلیم میں یوں کی ہے:

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں — گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے — سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت — پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات
بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

فرنگی مدنیت ایک ہمہ گیر مہاجنی نظام ہے جس کی بنیاد بے رحمانہ لوٹ کھسوٹ پر ڈالی گئی ہے۔ یہ ظالمانہ معیشت انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں ایک استحصالی قوت کے طور پر برسرِ عمل ہے۔ اس کے معاشی نظام کی بظاہر چمک دمک محض ایک سراب ہے۔ انسانی زندگی کو جو چیز ذہنی اور روحانی آسودگی دے سکتی ہے۔ مثلاً علم و حکمت، سائنسی ایجاد وغیرہ ان سب کو اس نظام نے اپنی گرفت میں لے کر ان کی فیضان بخشی کو صرف ایک نہایت مختصر طبقے تک محدود کر دیا ہے۔ بنکوں کی وسیع عمارتوں کے اندر دولت ایک سیلِ رواں کی صورت امرا کی جیبوں میں منتقل ہو رہی ہے اور اس کے نتیجے میں غربا پیسے پیسے کو ترس رہے ہیں۔

علامہ اقبال نے بنکوں کے متعلق "پس چہ باید کرد" میں لکھا ہے:

این بنوک[53] این فکر چالاک یہود — نور حق از سینۂ آدم ربود
تا تہ و بالا نہ گردد این نظام — دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

یہ نظام دانش، تہذیب اور دین کو زندہ رہنے کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ جب ان کو زندہ رہنے کا حق ملے گا تو یہودی ذہن کی ہمہ نوع فریب کاری پنپ نہیں سکے گی۔ علامہ نے فرنگی تہذیب کا سب

بڑا ترجمان میکیاولی کو گردانا ہے اور میکیاولی کو وہ "فلارنساوئی باطل پرست" کہتے ہیں :

آں فلارنساوئی باطل پرست سرمۂ او دیدۂ مردم شکست

اس لوٹ کھسوٹ کے نظام کی سب سے بڑی اور واضح علامت یہودیت ہے - یہودیت جو اقتصادی چیرہ دستی کی موجد بھی ہے اور علم بردار بھی - علامہ نے ضربِ کلیم کے اندر سیاسیاتِ مشرق و مغرب کا ایک پورا باب قائم کر کے یورپ اور یہود، کے زیرِ عنوان لکھا ہے :

یہ عیشِ فراواں، یہ حکومت، یہ تجارت دل سینۂ بے نور بھی محرومِ تسلی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلی
ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیبِ جواں مرگ شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی (یورپ اور یہود)

اور آگے چل کر فرمایا ہے :

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس (سیاستِ افرنگ)

سیاستِ افرنگ کا یہ رخ جسے اپنے طریقِ عمل کے لحاظ سے ابلیس پروری کہنا چاہیئے - بڑی خطرناک ہے۔ ایک ہی ابلیس نے حشر بپا کر رکھا ہے دو صد ہزار ابلیس کیا کچھ نہیں کرنے پر قادر ہوں گے ؟ پیامِ مشرق میں "نقشِ فرنگ"، کے نام سے ایک طویل نظم شامل ہے جس کے نو بند ہیں جس میں تہذیبِ فرنگ سے مخاطب ہو کر کہا ہے :

عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری عجب این است کہ بیمارِ تو بیمار تر است

ایک اور بند کے یہ شعر ملاحظہ فرمایئے :

عقل چوں پائے دریں راہِ خم اندر خم زد شعلہ در آب دوانید و جہاں برہم زد
کیمیا سازئی او ریگِ رواں را زر کرد بر دلِ سوختہ اکسیرِ محبت کم زد
وائے بر سادگی ما کہ فسونش خوردیم رہزنے بود، کمیں کرد و رہِ آدم زد
ہنرش خاک برآورد ز تہذیبِ فرنگ باز آں خاک بچشمِ پسرِ مریم زد

شررے کاشتن و شعلہ درودن تا کے
عقدہ بر دل زدن و باز کشودن تا کے

آخری شعر میں انھوں نے ایک سوال کیا ہے۔ یہ سوال اپنے آپ سے بھی ہے اور اس کا جواب کافی مدت پہلے وہ دے چکے ہیں:

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اس کے بعد انھوں نے طویل مدت تک تہذیبِ مغرب کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے خود اس تہذیب کی اسلام دشمنی، مشرق دشمنی، افسوں گری، میکیاولیت، رہزنی، استحصالی طریقِ عمل، اقتصادی لوٹ کھسوٹ، سامراجانہ ذہنیت، یہودیت طرازی، عشق فراموشی، عقل نوازی، مادیت پروری، لادینی سیاست، زیردست آزاری اور آدم کشی کا مشاہدہ کیا ہے اور اب ان کے لہجے میں زیادہ یقین پیدا ہوگیا ہے۔ جب وہ کہتے ہیں:

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہ گزرِ سیلِ بے پناہ میں ہے (بالِ جبریل)

اور وہ اہلِ خاور اور افرادِ ملت کو یہ مژدہ سناتے ہیں:

من دریں خاکِ کہن گوہرِ جاں می بینم
چشمِ ہر ذرہ چو انجم نگراں می بینم
دانہ را کہ بہ آغوشِ زمین است ہنوز
شاخ در شاخ و برومند و جواں می بینم
کوہ را مثلِ پرِ کاہ سبک می یابم
پرِ کاہے صفتِ کوہ گراں می بینم
انقلابے کہ نگنجد بہ ضمیرِ افلاک
بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم